افسانوی ادب میں" قحط "کے مباحث

Discussions of Famine in fiction

ڈاکٹر عاصمہ

p ISSN: 2789-4169

e ISSN :2789-6331

Received: 25-5-2023

Accepted:
Online:

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract:"Literature and society are strongly inter related as literature mirrors society and affects it so much as to bring numerous changes. Literature is just like a stone that produces ripples in a pool. Any changing in society affects the whole fabric of literature because literature gets raw material from society. Disasters directly affect both literature and writer. The writer, who is a sensitive citizen, finds attraction in disasters and gets effective material. Most of the best seller and popular books are related to war or revolution. We can categorize them as disaster. In Urdu fiction, we can divide disasters into two classifications: first Natural disaster and second is human instigated. Various phenomenons like earthquakes, famine, floods and epidemics are all natural disasters that kill thousands of people and destroy economy of many countries. There is no period in man's history which is safe from these natural disasters. That is why we find literature about these disasters in every language of the world. Even Urdu literature also reflects the impacts of these disasters on society. Famines are extreme shortage of food that results in high rates of mortality. People facing famine show the symptoms of fat loss, depression, severe weakness which result in immobility and eventually the death of the poor victims. Besides physical impacts, there are lots of social consequences of famines e.g migration of people, disturbance in social

behaviours and loss of pride and dignity."
Keywords: Famines, Shortage, Mortality, Depression, Immobility, Social Consequences, Pride and Dignity.

کلیدی الفاظ: قحط، قلت، اموات، افسردگی، عدم استحکام، سماجی نتائج، فخر اور وقار

زلزلے میں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دُخترانِ مادرِ ایّام ہیں (اقبالؔ)

ارضی و سماوی سانحات کی ذیل میں ان قدرتی آفات کا ذکر آئے گا۔ جو بنی نوع انسان کی تباہی و بربادی کا موجب بنتی ہیں اور یہ آفات قدرت کے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق مختلف ادوار اور زبانوں میں بنی نوع انسان کو متاثر کرتی رہی ہیں۔ آغاز کائنات سے دیکھیں تو خداوند تعالیٰ نے اپنی نافرمان قوموں کو انہیں قدرتی آفات کے ذریعے نیست و نابود بھی کیا جن میں زلزلہ، سیلاب، وبا اور قحط شامل ہیں۔ خاص قحط کے حوالہ سے دیکھا جائے تو یہ دوسری بڑی آسمانی آفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی۔ اِس کی سب سے قدیم مثال ہمیں داؤد علیہ السلام کے دور میں ملتی ہے۔ بائبل مقدس کی کتاب سموئل کے مطابق:

"اور داود کے دنوں میں پے در پے تین سال قحط پڑا اور داؤد نے خداوند کے حضور سے دریافت کیا تو خداوند نے کہا کہ یہ شاول اور اس کے گھرانے کی تقصیر خون کے سبب۔"(1)

قحط اور خشک سالی کا ایک اور حوالہ پرانے عہد نامے میں ارمیا نبی کی کتاب میں ملتا ہے۔ یہ خشک سالی یروشلم شہر میں دیکھی گئی:

"وہ خاک میں سیاہ پوش پڑے ہیں اور یروشلم کا چلانا بلند ہوتا ہے۔ شرفا ادنیٰ آدمیوں کو پانی کے لیے بھیجتے ہیں۔ وہ کنوؤں پر آتے ہیں پر پانی نہیں پاتے۔ وہ اپنے برتن خالی لے کر واپس جاتے ہیں۔ وہ شرمندہ اور نادم ہو کر اپنے سروں کو ڈھانپتے ہیں، کھیتی باڑی بند ہو گئی کیونکہ زمین پر مینہ نہیں برستا۔ اس لیے کسان شرمندہ ہو کر اپنے سروں کو ڈھانپتے ہیں۔ ہرنی میدان میں بچہ دیتی ہے اور اسے گھاس کے نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ جاتی ہے۔ بندر چٹانوں پر کھڑے ہو کر گیدڑوں کی مانند ہوا کو سونگھتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں رہ جاتی ہیں۔ اس لیے سبزی نہیں ملتی۔"(2)

قحط کا لفظی معنی کال، خشک سالی، کمیابی کے ہیں۔ جبکہ اصطلاحی حوالے سے دیکھا جائے تو قحط سے مراد:

"خوراک کا آبادی کی نسبت کم ہونا بلکہ ناکافی ہونا"(3)

زمین میں طرح طرح کی خرابیوں کے باعث پانی ہوا غلہ پھل ناقص ہو جاتے ہیں جس کے سبب خوراک کی قلت ہو جاتی ہے۔ افریقی ممالک اکثر اس تراتی آفت کی زد میں آتے رہتے ہیں:

> "The word famine means that the complete absence of food. Famine and hunger are not new Problems, nor are they confined to the those word malnuntriton Starvation population expansion and natural disaster all have There own part in famine."(4)

معاشرے میں جو بھی واقعہ یا سانحہ پیش آتا ہے اس کا عکس ہمیں ہمیشہ ادب میں نظر آتا ہے۔ کیونکہ ادیب زندگی کے اِن سانحات سے دوہری سطح پر متاثر ہوتا ہے۔ ایک تو اِس لیے کیونکہ وہ معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے اور معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے کسی بھی ہنگامے سے عام آدمی کی نسبت زیادہ متاثر ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ ادیب کے لیے تو زندگی ہی ماڈل یا نمونہ ہوتا ہے۔ جس سے اُس نے مواد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اِس لیے جب وہ لکھنے بیٹھتا ہے تو یہی سانحات اس کی تحریر کا موضوع بنتے ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ اُٹھا کر دیکھی جائے تو بھی ہمیں اِس کی واضح مثالیں نظر آتی ہیں کہ سانحہ چاہے سیاسی و سماجی ہو یا پھر ارضی و سماوی لکھنے والوں نے کسی بھی موضوع کو فراموش نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بھوک، افلاس، غربت، اور قحطِ بنگال اُس دور کے تمام مصنّفین کی تحریروں کا موضوع رہا ہے۔

"ان داتا" **کرشن چندر** کے شاہکار افسانوں میں سے ایک افسانہ ہے۔ اردو افسانہ نگاری میں اسے بقائے دوام کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ افسانہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کے عنوان درج ذیل ترتیب سے رکھے گئے ہیں:

1۔ وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے۔

2۔ وہ آدمی جو مر چکا ہے۔

3۔ وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے۔

ہر حصہ کی ساخت اور ہیئت جداگانہ ہے۔ پہلا باب مکتوبات پر مشتمل ہے جو ایک دیسی سفارت خانے کا رکن اپنے سفارت خانے کو لکھتا ہے، ان خطوط کی تعداد بائیس ہے۔ یہ رکن اپنی حکومت کی طرف سے ہندوستان یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ آیا بنگال قحط کی زد میں ہے یا نہیں ہے۔ بنگال آکر وہ ہندوستان کی حالت اور قحط کے بارے میں اپنے افسر اعلیٰ کو ان خطوط کے ذریعے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اُسے اتنے ماہ یہاں قیام کے بعد بھی اصل حقیقت معلوم نہیں ہو پاتی کہ آیا بنگال قحط کی زد میں آچکا ہے یا نہیں۔ اس کے خیال میں ہندوستان کبھی غذائی بحران کا شکار ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ہندوستان کی اغلب آبادی شب و روز غلہ اور بچے پیدا کرنے میں مصروف رہتی ہے اس کا اظہار وہ اپنے تیسرے خط میں کرتا ہے:

"۔۔۔ دراصل یہ پڑھے لکھے۔ ہندوستانی بھی بڑے جاہل ہوتے ہیں۔ کتابی علم سے قطع نظر انہیں اپنے ملک کی صحیح حالت کا کوئی اندازہ نہیں۔ ہندوستان کی دو تہائی آبادی دن رات غلہ اور بچے پیدا کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ اس لیے یہاں پر غلے اور بچوں کی کمی کبھی نہیں ہونے پائی۔"(5)

اس قسم کے طنز پورے افسانے میں کیے گئے ہیں جس میں ہندوستانیوں کی غربت اور بے حسی کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ افسانے کے آخر تک اس بے بصیرت شخص کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہندوستان "سکھیا" بیماری میں نہیں مبتلا بلکہ قحط کا شکار ہے:

"آج ہمارے سفارت خانے کے باہر دو عورتوں کی لاشیں پائی گئی ہیں جو ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھیں۔ شاید "سکھیا" کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ ادھر بنگال اور غالباً سارے ہندوستان میں "سکھیا" کی بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ اس عارضے میں انسان گھلتا جاتا ہے اور سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر مر جاتا ہے یہ بڑی خوفناک بیماری ہے۔"(6)

اپنے مختلف خطوط میں ہندوستان کی حالت کو بھی بیان کرتا ہے جس میں میں اپنے سفارت خانے کے باہر مردہ بچوں کا پایا جانا سے لیکر بنگالی والدین کا بھوک کے ہاتھوں تنگ آکر اپنی بیٹیوں کو معمولی پیسوں کے عوض بیچنے کے مناظر تک کو دکھایا گیا ہے:

"چاول آجکل بازار میں ۲۰ روپے فی کلو کے حساب سے مل رہے ہیں اگر ایک کنبہ اپنی دو بچیاں بھی فروخت کر دے تو کم از کم آٹھ دس دن زندگی کا دھندا کیا جاسکتا ہے اور اوسطاً بنگال میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔"(7)

افسانے کا دوسرا حصہ "وہ آدمی جو مر چکا ہے" کے عنوان سے لکھا گیا ہے یہ مکالمہ کی صورت میں پیش کیا گیا اس حصے میں متمول طبقے کے ایک لاپرواہ اور ہر وقت عالم عشرت و نشاط میں مگن رہنے والے فرد کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ افسانے کا آغاز ہی قحط زدہ بنگال کے لوگوں کی بے بسی سے ہوتا ہے جس کے بارے میں کہانی کے مرکزی کردار کو اخبار کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ صبح ناشتہ پر آملیٹ کھاتے کھاتے اس نے اخبار کھولا تو اس کی نظر اُن تصاویر پر پڑی جن میں قحط زدہ، بھوک کا شکار لوگ کلکتہ کی سڑکوں، فٹ پاتھوں اور پارکوں میں مرے پڑے تھے۔ سینکڑوں ایسے تھے جو بھوک پیاس سے نڈھال دم توڑ رہے تھے۔ یہ سب سوچتے اس کے ذہن میں گزشتہ رات سنہیہ کے ساتھ گزرے پل یاد آجاتے ہیں اور وہ ایک دم پھر ان تمام باتوں کو بھول جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ اُس کی نظر اخبار پر پڑتی ہے تو وہ مغموم ہوتا ہے کہ اس کے ہم وطن سسک رہے ہیں لیکن وہ ان کی مدد نہیں کر رہا اتنے میں اس کی محبوبہ اس کے پاس آتی ہے وہ اُسے بتاتا ہے کہ وہ ان قحط زدہ لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ سنہیہ یہ سن کر اُسے ایسی کسی کوشش سے منع کرتی ہے:

"بیمار ہو جاوگے۔ وہ بیچارے تو مر رہے ہیں انہیں آرام سے مرنے دو۔ تم کیوں مفت میں پریشان ہوتے ہو۔"(8)

مختلف منصوبہ بندی کرنے کے بعد وہ آخر میں ایک بار پھر اپنی محبوبہ کے ساتھ گرانڈ ہوٹل میں شراب نوشی اور ناچ گانے میں

مصروف ہو کر اپنے ہوش سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

افسانے کا تیسرا حصہ ''وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے'' کہ عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس حصے میں کرشن چندر نے بڑی خوبصورتی سے ایک ایسے شخص کی روداد بیان کی ہے جو سفارت خانے کے باہر بھوک اور افلاس کے ہاتھوں مرا پڑا ہے۔ افسانہ کا یہ حصہ خود کلامی پر مبنی ہے۔ افسانے میں بتایا گیا ہے کہ مرا ہوا شخص جو اب ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہے کبھی گوشت پوست کا تنومند انسان تھا وہ ایک مقامی زمیندار کے گھر ستار سکھانے جاتا تھا لیکن جب قحط پڑا تو سب کو روٹی کے لالے پڑے اس لیے اس کی نوکری بھی چلی گئی بھوک سے تنگ آکر وہ اپنی بیوی کو لے کر کلکتہ کا سفر کرتا ہے قحط زدہ قافلے کے لوگوں کا احوال بیان کرتے ہوئے کرشن چندر لکھتے ہیں:

> ''اس قافلے کے اوپر گدھ گھوم رہے تھے اور ساری فضا میں مردہ گوشت کی بو تھی۔ چیخیں تھیں۔ فضا میں آہ و بکا اور آنسوؤں کی سیلن اور لاشیں جو سڑک پر طاعون زدہ چوہوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ لاشیں جنہیں گدھوں نے کھالیا تھا اور اب ان کی ہڈیاں دھوپ میں چمکتی نظر آتی تھیں۔ لاشیں جنہیں گیدڑوں نے کھالیا تھا۔ لاشیں جنہیں کتے تک کھا رہے تھے لیکن چونٹیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ چیونٹیاں بنگال کے ہر حصے سے بڑھتی چلی آ رہی تھیں اور ان کے ذہن میں کلکتہ کی لاش تھی... موت کا ایک وقت مقرر تھا کے شاید ایسا ہی ہونا تھا ان لوگوں کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔''(9)

کرشن نے کلکتہ کے بازاروں کی بڑی دردناک تصویریں پیش کی ہیں جو ہر حساس انسان کو ہلا کر رکھ سکتی ہیں ہوٹلوں کے باہر انسان اور کتے کھانا ٹٹول رہے ہیں۔ کم سن بچے گداگری کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان عورت مادرِ زاد ننگی کھڑی ہے۔ اسے اپنے ننگے پن کا، نسوانیت کا احساس تک نہیں۔ ہندو اور مسلمان مذہبی تعصب میں اندھے صرف اپنے ہم مذہبوں کو بھیک دیتے ہیں اور غیر مذہب کے بھکاریوں کو نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں۔ قحط اور بھوک نے انسانی فطرت کے اسفل پہلوؤں کو ننگا کر دیا۔

بلاشبہ افسانے کے تین حصے اس میں یوں تحلیل اور پیوست ہو گئے ہیں کہ افسانے میں ربط ضبط اور نظم کی کمی کا احساس نہیں ہوتا اور پورا افسانہ ایک اکائی کی صورت میں ابھرتا ہے۔ یہ کرشن چندر کی فنی چابکدستی کا اعجاز ہے۔ اردو افسانہ نگاری کو فخر ہونا چاہیے کہ کرشن نے ان کے لیے ''ان داتا'' تخلیق کیا۔

جگدیش چندر وھان ان کے اس افسانے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو افسانہ نگاری میں اس افسانے کو بقائے دوام حاصل ہے اور کرشن چندر کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے یہ واحد افسانہ ہی کافی ہے۔ اس کی اشاعت کے پچاس سال بعد بھی گردِ امتدادِ زمانہ اس کے تاثر اور تب و تاب کو کم نہیں کر سکی۔''(10)

ابراہیم جلیس کا شمار بھی اُردو ادب کے مایہ ناز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے بنیادی موضوعات غربت، بے روزگاری، جبریت اور عصمت فروشی ہے۔ اس کے علاوہ ابراہیم جلیس اس دور کے ہر ادیب کی طرح قحط بنگال سے بہت متاثر ہوئے، انہیں بنگال میں آنے والے اس قحط سے زیادہ طاقتور اور صاحب اقتدار طبقے کی بے حسی نے غمزدہ کیا اور اسی غم کا اظہار وہ تحریروں میں اکثر کرتے ہیں افسانہ بلیک آوٹ میں لکھتے ہیں:

"واہ رے تضاد کلکتہ میں ہزاروں انسان دم توڑ رہے ہیں اور دوسری طرف عیش کر رہے ہیں یہ لوگ۔۔۔"(11)

جلیس کو اس امر کا احساس ہے قحط محض طبعی حالات کا پیدا کردہ نہیں یہ ایک نظام کی لوٹ مار کے لیے موزوں ترین لمحہ بھی ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ بنگال میں عوام کو بھوک وافلاس میں مبتلا کرنے کے لیے ۱۹۴۳ء میں زندگی کا دائرہ سامراجی قوتوں نے تنگ کر دیا۔ چاول بازاروں سے چور بازاری کے ذریعے اٹھوالیے گئے۔ اور یہ صورت حال صرف بنگال تک ہی محدود نہ رہی بلکہ وبا کی طرح پورے ہندوستان میں پھیلنے لگی۔ قحط بنگال کے نمائندہ افسانے ریلیف فنڈ میں اس قسم کی صورتحال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بنگال اب ساری ہندوستان میں پھیل گیا ہے... میں نے حیدرآباد میں بھی بنگال دیکھا ہے۔"(12)

قحط بنگال اور اس کے اسباب پر ان کا ایک اور افسانہ کیوں کنگال ہوا، جس میں انہوں نے بنگال کے قحط کی وجوہات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ "چور" میں بھی قحط بنگال کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ابراہیم جلیس کی افسانہ نگاری پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر امتیاز بلوچ لکھتے ہیں:

"جلیس کے دورِ اول کے افسانوی مجموعے زرد چہرے کی کہانیوں کے موضوعات زندگی نامہ ہیں۔ جن میں زندگی کے عام اور اہم مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ جلیس کی موضوعات کائنات میں غربت، جہالت، احتیاج، بے روزگاری، جبریت، قحطِ بنگال، عالمی جنگ کی تباہ کاریاں شامل ہیں۔"(13)

ابوالفضل صدیقی کا شمار اردو ادب کے اُن چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو جاگیرداری کلچر، محلاتی سازشوں اور طبقہ اشرافیہ کے مخصوص معاشرے کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ۱۹۴۲ء میں آنے والے قحط کو دل سے محسوس کیا اور اسی لیے اپنے پہلے افسانوی مجموعے "اہرام" میں بیشتر افسانوں میں غربت، بھوک اور قحط پر لکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے خوبصورت افسانہ بھوک ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار "پیتا" ہے جو اپنے ماں باپ کو بھوک کے ہاتھوں مرنے سے نہیں بچا پایا ہے۔ دونوں بھوک اور قحط کے ہاتھوں اُس کے ہاتھوں میں دم توڑ دیتے ہیں۔ ماں باپ مرنے کے بعد وہ کلکتہ کا رخ کرتا ہے تو وہاں اپنی بیوی اور بچی کو فاقوں کا شکار پاتا ہے۔

ماں باپ کو کھونے کے بعد وہ دونوں کو موت سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے کلکتہ میں اُس کا واسطہ ایک مشنری پادری سے ہوتا ہے جو اپنی مذہبی بھوک کو مٹانے کے لیے اس کی بیٹی کو نشانہ بناتا ہے۔ دوسری طرف اُس کی بیوی جنسی بھوک مٹانے کا سبب بن جاتی ہے۔ افسانہ میں وقت کے مناظر کے ساتھ ساتھ خطابت بھی کی گئی ہے۔

افسانے میں ابوالفضل صدیقی نے جہاں ایک طرف قحط، بھوک افلاس اور انسانی بے بسی کو بیان کیا ہے تو دوسری طرف معاشرے کی بے راہ روی پر بھی گہرا طنز کیا ہے۔ پیتا کا کردار ایسا کردار ہے جو دونوں قسم کی بھوک کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف ماں باپ بھوک اور افلاس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں تو دوسری طرف بیوی اور بچی مذہبی اور جنسی بھوک کا شکار ہو چکی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کے اندر زندگی سے اعتبار اُٹھ چکا ہے:

> ''پشاور ایکسپریس پوری رفتار سے اڑی چلی جارہی تھے۔ پتھر کے صاف پلیٹ فارم چاولوں کی ساکت سونڑیوں کے درمیان ایک رزق کا کیڑا پڑا تھا... ہر اشتہار سے بے نیاز بے حس و حرکت جامد و ساکن جیسے پلیٹ فارم کے پتھروں میں سے ایک پتھر... جو نہ بیٹا تھا نہ باپ... نہ پر تیم تھا نہ لال... ہر اعتبار سے بھوکا... سب بھوکوں سے ہزیمت خوردہ''(14)

اس کے علاوہ افسانے میں مصنف نے کہیں کہیں طنز سے بھی کام لیا ہے۔ افسانہ میں خدمت خلق کی تنظیم پر بھی گہرا طنز کیا گیا ہے جس کے انتظار میں لوگ گھروں سے نکل نکل کر گاڑیوں کے قافلے کو دیکھتے ہیں کہ شاید اس میں ان کے نجات دہندہ ہوں:

> ''خدا بڑا رازق ہے سنا ہے خدام المسلمین والے کار میں چلتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ جو آگے آگے دونوں کاریں ہیں، انہی کی ہیں۔''(15)

قحط بنگال سے بھوک، افلاس، غربت دوسری جنگ عظیم کے بعد ہر مصنف کی تحریروں کے موضوع رہے ہیں اس سلسلے میں بہت سے افسانوں نگاروں کے ہاں اس کے واضح اشارے ملتے ہیں، **خواجہ احمد عباس** بھی انہی میں سے ایک ہیں جنہوں نے مختلف علاقوں، شہروں کی معاشرتی و ثقافتی مہک کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے اس لیے بنگال کی بات کرتے ہوئے وہ اکثر جنگ عظیم کے بعد یہاں کی معاشی بدحالی، بھوک افلاس کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''بھوک ہمیشہ زندگی کی ہتک کرتی آئی ہے، کئی صدیوں سے ان گنت نسلوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے، کتنی سکڑ جاتی ہے دنیا۔ جب بھوکے پیٹ کے اندر روٹی کا ٹکڑا نہیں جاپاتا۔''(16)

اسی افسانے میں آگے چل کر پھر اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر انسان کے پاس روٹی نہیں ہوتی تو اُس کے اندر سے عقیدے اور نیکی بدی کی تمیز بھی ختم ہو جاتی ہے:

"جب روٹی نہیں ملتی تو گویا نیکی بھی مر جاتی ہے اور بدی بھی"(17)

دیوندر ستیارتھی نے اسی غربت اور افلاس اور قحط کے حالات کو ایک اور افسانے "نئے دھان" میں زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جس میں ایک غریب کسان کی کسمپرسی سے گزرتی زندگی کے ساتھ ساتھ زمیندار اور جاگیر دار رویوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ کہ قانون ہمیشہ انہی کا ساتھ دیتا ہے:

"جب زمیندار کے کارندے، سرکاری ملازم، سپاہی اور تھانیداران داخل ہوتے ہیں: ایک زمیندار کے لٹھ باز پیادے، ایک غریب کسان کو گھسیٹتے ہوئے لیے آتے ہیں۔ پیچھے پیچھے بیچارے کی گھر والی چلی آتی ہے۔ ایک بھولی، مریل، مصیبت زدہ گائے بقایا لگان، بے دخلی یہ دو تیر ہیں جو زمیندار چلائے گا۔ چلا کر رہے گا۔"(18)

قدرت اللہ شہاب کا افسانہ "غریب خانہ" بھی قحط بنگال کے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ کہانی کی مرکزی کردار ایک نوجوان لڑکی کا ماضی ہے۔ جس کا خاندان قحط کا شکار ہو چکا ہے اور وہ اپنی جھگی میں اکیلی رہ گئی ہے۔ افسانہ جہاں قحط، بھوک، افلاس کو بیان کرتا ہے وہی ہوس پرست سماج کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ والدین کی وفات کے بعد سے کامنی کو مجبور کیا گیا کہ وہ گاؤں کے سرپنچ سوشیل ٹھاکر کے ہاں ملازمت اختیار کرے۔ دوران ملازمت وہ سرپنچ کی ہوس پرستی کا نشانہ بننے سے پہلے ہی وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور حکومت کے قائم کردہ غریب خانے جانے کو ترجیح دیتی ہے۔ لیکن وہاں جانے کے بعد اُسے پتہ چلتا ہے وہاں بھی سب عزتوں کے لٹیرے بیٹھے ہیں اور صرف اُسی کو کھانا ملتا ہے۔ جو اُن کی خواہش کو پورا کرتا ہے۔ غریب خانے میں ایک دن گزارنے کے بعد وہ وہاں سے بھی بھاگنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ غریب خانے میں مقیم پناہ گزینوں کی غربت کا نقشہ کھینچتے ہوئے قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

"غریب خانے میں چار سو پچاس روحیں تھیں۔ ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگوں والے ہڈیوں کے ڈھانچے سسکتے ہوئے آدمی... سوکھی لٹکی ہوئی چھاتیوں والی، رینگنے والی بوڑھی عورتیں جن کے بال ان کی ہڈیوں کی طرح سوکھ کہ جھڑ گئے تھے... بے شمار چھوٹے چھوٹے بچے جن کے پیٹ پھولے ہوئے تھے اور ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔"(19)

غربت اور قحط زدہ اس معاشرے میں لوگ مٹھی بھر چاول یا ایک روٹی کے لیے عزتوں کا سودا کرنے میں زرہ بھی عار محسوس نہیں کر رہے تھے اور یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا کہ بعض خاندان خود اپنی عورتوں کو بیچ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ کامنی کی دوست کا شمار بھی انہی بے بس لوگوں میں ہوتا ہے جو ایک کمبل اور بسکٹ کے ایک پیکٹ کے عوض اپنی عزت کا سودا کرنے پر مجبور تھی:

"اور پھر رقمن نے ایک لال لال خوبصورت کمبل کی تہہ اٹھا کر کریم کریکر بسکٹوں کا ایک ڈبہ نکالا۔ بہت تھک گئی ہو۔ لو یہ بسکٹ کھالو"

تیرے پاس یہ بسکٹ کہاں سے آئے، رقی؟ اور یہ کمبل؟"

"پگلی! کال تو چاولوں کا ہے۔ بسکٹوں کا کال تھوڑی ہے"(20)

"سب کا مالک" بھی اسی سلسلے کا دوسرا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں بھی قحط کے دوران اپنی عزت بچاتی ایک مجبور ماں کی کہانی کو بیان کیا ہے جس کو بھوک اور افلاس نے طوائف بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ افسانے میں قحط کے اثرات اور اس کے نتیجے میں ہونے والی اموات کو بیان کرتے ہوئے قدرت لکھتے ہیں:

"اور جب گلی کوچوں میں نندی گرام کے ہنستے کھیلتے چہرے ہڈیوں کے ڈھانچے بن کر گرنے لگے۔ تو رضیہ کے کنگنوں کا خیال دونوالے چاول بن کر اُبل گیا۔ بچوں کی پسلیاں چُر چُر کر کے اندر کی طرف دھنس گئیں اور پیٹ غبارے کی طرح پھول کر ابھر آئے... ہم لتا کی ماں نے بیٹی کے کپڑوں پر تیل چھڑک کے آگ لگادی اور پھر اپنے گلے میں رسی ڈال کر آم کے درخت سے لٹک گئی۔ ایک دن صبح سویرے لوگوں نے دیکھا کہ رضیہ کا باپ جھونپڑی کے باہر اوندھا پڑا ہے اور ایک بھوکا پیاسا گیدڑ اس کی ایڑیوں میں دانت گاڑے خرخر منہ چلا رہا ہے۔ رضیہ کے باپ میں ابھی ایک رمق جان باقی تھی۔ لیکن اس کے بدن میں اتنا سہارا نہ تھا کہ وہ اس حریص درندے کے منہ سے اپنا پاؤں چھڑا لے۔"(21)

بنگال میں آنے والے اس قحط سے تنگ آکر لوگ کلکتہ جانے پر مجبور تھے۔ بہت سے لوگ بنگال کی گلیوں اور سڑکوں پر ننگ دھڑنگ پڑے ملتے۔ کچھ قافلوں کی صورت کلکتہ جاتے راستے میں قحط کا لقمہ بن جاتے اور لوگ اپنے پیاروں کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھنے پر مجبور تھے۔ رضیہ کی ماں بھی ایسے ہی ایک قافلے کے ساتھ کلکتہ پہنچی تو یہاں ہر کوئی اُسے بھیڑیا کی طرح پھاڑ کھانے کو ملا۔ سارا دن وہ اپنی بیٹی کو لیے اپنی عزت بچاتے یہاں سے وہاں ماری ماری پھرتی رہی:

"وہ دیکھ رہی تھی کہ کلکتہ بھی بھوکا ہے... ایک روپیہ... پانچ روپیہ۔ بیس روپیہ، پچاس روپیہ... چاول کی طرح عورت کا بھاؤ چڑھتا جا رہا تھا۔ بھوکے پیاسے لوگ ہاتھ پھیلائے تڑپ رہے تھے... ہر جوان عورت کو دیکھ کر ان کے دل سے بے ساختہ فریاد نکلتی تھی۔ کہ اوماں، او بہن، او بیٹی، ذرا ٹھہرو۔۔۔"(22)

قدرت اللہ شہاب کے یہ دونوں افسانے قحط بنگال میں ہونے والی ہولناک اموات، انسانی بے بسی اور اس قحط کے نتیجے میں معاشرے کے صاحب اقتدار کی بے حسی اور بے غیرتی کو بے نقاب کرتے ہیں جو مصیبت کی اس گھڑی میں بھی حیوانوں کے بہروپ میں موجود تھے۔

سید شبر حسین کے افسانوی مجموعے "یہ آگ" کے تمام افسانے دوسری جنگ عظیم اور قحط بنگال کے موضوع کے گرد گھومتے ہیں خاص کر کے "جنگ اور بھوک"، "مسکراتا ہوا پھول"، "ایک کہانی ایک پہلی"، "گوشت اور پتھر"۔

افسانہ "جنگ اور بھوک" میں انہوں نے دو ایسے سپاہیوں کی کہانی کو بیان کیا ہے جو جنگ میں حصہ تو لے چکے ہیں لیکن انہیں جنگ کے نتیجے میں ہونے والی بربادی نہیں پسند۔ کہانی کا راوی جنگ میں استعمال ہونے والے بارود اور ایٹم بم کے استعمال پر نالاں ہے کیونکہ اس سے انسانیت کا تقدس پامال ہو رہا ہے۔ جنگ کے دوران ہی اُسے وہ لڑکی بھی یاد آتی ہے جس نے اپنے مرتے ہوئے پتی کے لیے اس سے بھات کا تقاضا کیا تھا:

> "جب بنگال میں بھوک کا طوفان آیا تھا۔ عورت پیٹ کے شعلے بن گئی تھی۔ ہم دونوں پاربتی پور کے اسٹیشن پر کھڑے تھے۔ چاروں طرف بھوک کے بیمار ننگے ڈھانچے رینگ رہے تھے۔ ایک سسکتی ہوئی نیم عریاں لڑکی ہمارے پاس آئی۔ اور اس نے کہا "بابو! میرا پتی بھوک سے دم توڑ رہا ہے۔ پرماتما کے لیے مجھے بھات لے دو... اور... اور وہ ہچکیاں لینے لگی۔"(23)

نیلم احمد بشیر کا افسانہ "اثاثہ" صومالیہ کے قحط پر لکھا ہوا ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ افسانے میں انہوں نے ایک خاندان کی صومالیہ سے "دوداب" کی طرف ہجرت کا منظر پیش کیا ہے۔ "اثاثہ" اس موضوع پر لکھے گئے دوسرے تمام افسانوں میں ممتاز حیثیت اختیار کر گیا۔ نیلم احمد بشیر نے افسانے کی منظر کشی اس خوبصورتی سے کی ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا ہے۔ ہجرت کرنے والے خاندان میں عبدالحئ اس کی بیوی عمارہ اور اُن کا باپ شامل ہیں۔ عمارہ کے بھائی جہاد پر جا چکے ہیں اُن کا باپ بدرالدین بھی ان کے ساتھ ہے۔ گاؤں کے بہت سے لوگ جلد سے جلد دوداب پہنچنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے انہیں ہفتوں کا صحرائی سفر کرنا پڑنا تھا جو گاؤں میں رہنے سے زیادہ نقصان دہ اور خطرناک تھا لیکن اس کے باوجود ہر کوئی زندہ رہنے کے لیے کوشاں دکھائی دیتا ہے اور قافلے میں شامل ہو جاتا ہے:

> "گاؤں کے سبھی خاندانوں کا بھوک اور پیاس کے مارے برا حال تھا۔ کنویں تالاب سب سوکھ چکے تھے۔ ڈھور ڈنگر دم توڑ رہے تھے۔ سرسبز خشک ہو کر مرجھا چکی تھی اور قحط کا بھوت چاروں طرف ننگا ہو کر ناچ رہا تھا۔ چاروں طرف سے بری بری خبریں آ رہی تھیں کہ بھوک پیاس کے مارے سینکڑوں بچے مدقوق ڈھانچوں میں تبدیل ہو کر رزقِ خاک بنتے جا رہے ہیں۔
>
> گاؤں میں اعلان ہو چکا تھا کہ سب لوگ اپنا بچا کچھا سامان اور اشیائے خوردونوش سنبھالیں اور "دودآب" کی طرف چل دیں جو ایک بہت پرانا۔ اقوام متحدہ کے زیر نگرانی چلنے والا قابل اعتماد ریفیوجی کیمپ تھا۔"(24)

سارا افسانہ سفر کے دوران پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کو بیان کرتا ہے۔ دوران سفر ایسے بہت سے لمحے آئے کہ لوگوں کو

اپنے نیم مردہ بچوں کو چھوڑ کر آگے چلنا پڑا تاکہ زندہ رہنے والوں کے لیے سامان اور پانی محفوظ رکھا جاسکے۔ عمارہ کو بھی اپنے پانچ بچوں اور شوہر عبدالحیٔ چھوڑ کر آگے بڑھنا پڑا:

> "دیکھو بھائیو اور بہنو! ہم اب اس وقت ایک مشکل وقت بلکہ قیامت سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے بچے بھوک سے مر رہے ہیں۔ مگر ہمیں اپنے ہوش و حواس نہیں کھونا چاہیے۔ اپنا پانی راشن کر کے رکھیں۔ جو بچے اب اتنی سکت نہیں رکھتے کہ آگے جا سکیں۔ انہیں اللہ کے سپرد کریں اور آگے کو چلیں۔ ان کے لیے پانی بچائیں جو ابھی جیتے ہیں اور شاید جیتے ہی رہیں۔ میں جانتا ہوں یہ بہت کٹھن مرحلہ مگر ہم سب کو کرنا ہی ہو گا... بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے نیم مردہ بچے زمین پر لٹائے اور سینے کوٹ کوٹ کر بین کرنے لگے۔ آہیں سسکیاں اور گرم ہوائیں مل جل کر ایک ماتم میں تبدیل ہو گئیں اور چاروں طرف افسردگی چھا گئی۔"(25)

عمارہ کو گود میں اب صرف چار ماہ کا بچہ اور ستر سالہ باپ بدرالدین رہ گیا تھا۔ راستے میں ڈاکوؤں نے اچانک قافلے پر حملہ کر دیا اور قافلے کی عورتوں کی عزتوں کو تار تار کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود عمارہ مطمئن تھی کہ اُس کی جان اپنے بیٹے کے لیے بچ گئی۔ افسانے میں مصنفہ نے بڑی خوبصورتی سے انسانی فطرت کو بھی بے نقاب کیا ہے کہ روٹی کی بھوک مٹانے کے لیے انسان اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنے خونی رشتوں کو بھی بھولا بیٹھتا ہے۔ ایسا ہی عمارہ اور اُس کے باپ کے دوران ہوا تھا۔ چار بچوں اور عبدالحیٔ کی موت پر بابا بدرالدین اندر ہی اندر خوش ہے کہ پانی اور خوراک کو استعمال کرنے والوں کی تعداد کم ہو چکی ہے۔ عمارہ کے پاس بس اتنا سا پانی رہ گیا ہے کہ چار ماہ کے بچے کے ہونٹوں کو تر کر سکے لیکن بدر الدین بار بار بیٹی سے پانی کا تقاضا کرتا ہے لیکن عمارہ کسی طرح بھی پانی باپ کو دینے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں انسانی بے حسی کو نیلم احمد بشیر نے کمال خوبی سے بے نقاب کیا ہے:

> "اگر تو نے مجھے یہ پانی نہ دیا تو میں تیرے اس منحوس پلے کا خود گلا دبا دوں گا۔" بابا دیوانوں کی طرح چلاتا ہوا عمارہ کے پیچھے دوڑا مگر نقاہت کے مارے زمین پر گر گیا اور ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں کسی نیم جان مینڈک کی طرح باہر کو نکلی پڑی تھیں۔"(26)

نیلم احمد بشیر نے یہ افسانہ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے انسان اپنی بھوک اور پیاس مٹانے کے لیے یا زندہ رہنے کی خواہش میں اپنوں کی جان لینے کو بھی معیوب نہیں سمجھتا جیسے افسانے میں گھر کا سربراہ پانی کے چند گھونٹ کے لیے اپنی ہی بیٹی کے مد مقابل آجاتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "ورثہ" قحط میں پیش آنے والی مشکلات کے ساتھ ساتھ انسان فطرت کا عکاس بھی ہے۔

حوالہ جات

1۔ کلام مقدس، عہد عتیق، سوسائٹی آف سینٹ پال، 1958ء، سموئیل:۲۱:۱

2۔ کلام مقدس، عہد عتیق، سوسائٹی آف سینٹ پال، 1958ء، ارمیا:۱۴:۲

3۔ عزیزہ خاں، قدرتی آفات، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۵ء، ص:۱۷

4۔ Bhotia, B.M, Famines in India, Delhi: Konork Publishers, pvt. Ltd. 1985, P:87

5۔ کرشن چندر، ان داتا، دلی: اروابی پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص:۸

6۔ ایضاً، ص:۱۰

7۔ ایضاً

8۔ ایضاً، ص:۳۱

9۔ ایضاً، ص:۴۵

10۔ جگدیش چندر ودھان، کرشن چندر شخصیت اور فن، لاہور: نگارشات، س ن، ۴۱۷

11۔ ابراہیم جلیس، الٹی قبر، کراچی: مکتبہ جلیس، ۱۹۷۸ء، ص:۴۴

12۔ ایضاً، ص:۱۳۳

13۔ امتیاز علی بلوچ، ابراہیم جلیس- شخصیت و فن، ملتان: بہاوالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص:۱۲۳

14۔ ابوالفضل صدیقی، اہرام، ہاشمی بک ڈپو، ۱۹۴۵ء، ص:۲۵

15۔ ایضاً، ص:۳۰

16۔ خواجہ احمد عباس کے بہترین افسانے، (مرتبہ)، لاہور: مکتبہ شعر و ادب، س ن، ص:۱۸۵

17۔ ایضاً، ص:۱۹۰

18۔ دیوندر ستیارتھی، نئے دیوتا، لاہور: طن، ۱۹۴۲ء، ص:۱۹۰

19۔ قدرت شہاب، نفسیانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۱۶

20۔ ایضاً، ص:۱۶

21۔ ایضاً، ص:۵۳

22۔ ایضاً، ص:۵۷

23۔ سید شبر حسین، یہ آگ، لاہور: میری لائبریری، س ن، ص:۱۹

24۔ نیلم احمد بشیر، وحشت ہی سہی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۱۷۶

25۔ ایضاً، ص:۱۸۰

26۔ ایضاً، ص:۱۸۶

References:

1. Kalam-e-Muqadas, Ahd-e-Atiq, Society of Saint Paul, 1958, Samuel:1:21
2. Kalam-e-Muqadas, Ahd-e-Atiq, Society of Saint Paul, 1958, Armiya:2:14
3. Aziza Khan, Qudarti Afat, Lahore: Fiction House, 2015, P:17
4. Bhotia, B.M, Famines in India, Delhi: Konork Publishers, pvt. Ltd. 1985, P:87
5. Karishan Chandar, An Data, Dilli: Arwabi Publishers, 2004,P:8
6. Ibid, P:10
7. Ibid
8. Ibid, P:31
9. Ibid, P:45
10. Jagdeesh Wadhman, Karishan Chandar: Shakhsiyat aur Fun, Lahore: Nigarshat, P:417
11. Ibrahim Jalees, Ulti Qabr, Karachi:Maktaba Jalees, 1978, P:44
12. Ibid, P:133
13. Imtiaz Ali Baloch, Ibrahim Jalees: Shakhsiyat-o-Fun, Multan: Bah-ud-Din Zakriya University, 2004, P:23
14. Abu-Al-Fazal Sadiqi, Ahram, Hashmi Book Depot, 1945, P:25
15. Ibid, P:30
16. Khawaja Ahmad Abbas key Behtreen Afsane, (Maratiba), Lahore: Maktaba Shair-o-Adab, P:185
17. Ibid, P:190
18. Deonder Sathyarthi, Naye Dewta, Lahore: 1942, P:190
19. Qudrat-ul-llah Shahab, Nafsane, Lahore: Sang-e-Meel Publication, 2015, P:16
20. Ibid, P:16
21. Ibid, P:53
22. Ibid, P:57
23. Syed Shabr Hussain, Ye Aag, Lahore: Meri Library, P:19
24. Neelam Ahmad Basheer, Wahshat hi Sahi, Lahore: Sang-e-Meel Publication, 2015, P:176
25. Ibid, P:180
26. Ibid, P:186